میں تو ردیف ''کھدر'' رکھی گئی۔ انگریز دشمنی اور وطن دوستی نے نجم کو کانگریسی بنا دیا۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں۔''ہم نے ایسے بھی مشاعرے کئے ہیں جن کا مقصد حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ ایسے مشاعروں کو کانگریسی مشاعروں کا نام دیا جاتا تھا۔میرے ایک دوست برہم سروپ خارمیرٹھی میری طرح پکے کانگریسی تھے۔

8. ترقی کی برکتیں میں لکھتے ہیں: ''ہندوستان کی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوا۔ تضاد بڑھنے لگا اور آج وہ نوبت آئی کہ مسلم لیگ کو پاکستان کی تجویز پیش کرنی پڑی۔

صدمات: 1. سرکاری نوکری سے استعفیٰ کے بعد مالی بحران سے دوچار رہے۔ ماہنامہ ''مشورہ'' جاری کیا لیکن مالی حالت بدتر ہوگئی۔

2. پرنس معظم جاہ کے شاہانہ مزاج کو برداشت نہ کر سکے اور نوکری ترک کردی۔ کچھ دنوں کی فارغ البالی پھر مالی بحران میں تبدیل ہوگئی۔

3. 1953ء میں والد کا انتقال ہوگیا۔

4. 1958ء میں اہلیہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

5. برادر خرد کوکب آفندی اور دو بیٹیوں کا پاکستان میں ہمیشہ کے لئے آباد ہونا۔

علالت اور مرض الموت: نجم آفندی کو پرنس معظم جاہ شجیع کی دربارداری نے نیند کی گولیوں کا محتاج کردیا تھا، چنانچہ آخری عمر تک ان زہریلی دواؤں کا اثر باقی رہا۔ اعصاب میں تناؤ کم خوابی، لاغری اور ضعف کے علاوہ آخری عمر کے حصے میں معدہ، جگر، قلب کی بیماریاں اور رعشہ وثقل سماعت سے دوچار رہے۔ آخری عمر جو پاکستان میں گزری عموماً بہت کم باہر نکلتے تھے اور زیادہ تر بستر پر لیٹے رہتے تھے۔

پاکستان میں: 1. نجم آفندی پہلی بار اپریل 1971ء میں بمبئی سے بحری جہاز میں سوار ہوکر کراچی کی بندرگاہ پر اترے۔ کراچی میں چند مہینے قیام کر کے وہ لاہور گئے پھر کراچی آتے جاتے رہے۔ نجم صاحب محافل شعروسخن، مشاعروں مسالموں، مقاصدوں اور مجلسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے اور معروف ادیب،

شاعر اور خطیب سے ملاقاتیں رہیں۔ ان کا کلام روزناموں، رسالوں، جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ پاکستان کے مختلف شہروں میں قیام کے دوران بعض اوقات اپنی یادداشتیں ایک ڈائری میں بھی مرتب کیں جو ان کی ملاقاتوں اور محفلوں کی عمدہ یادگاریں ہیں۔

وفات : تاریخ 17/ذی الحجہ 1395 ہجری مطابق 21/دسمبر 1975ء

وقت : 9½ بجے صبح

مقام : کراچی

دن : اتوار

غسل میّت : وصیّت کے مطابق مکان پر ہوا

نمازمیت : بارگاہ رضویہ سوسائٹی میں پڑھائی گئی

دفن : سخی حسن دربار کے قبرستان واقع نارتھ ناظم آباد ہوا۔ شفیق اکبرآبادی نے تلقین پڑھائی۔ سوئم کی مجلس رضویہ سوسائٹی کے امام باڑے میں ہوئی۔ سید ضمیر نقوی صاحب نے مجلس پڑھی۔ جنازہ میں صرف پچیس تیس افراد نے شرکت کی۔

قطعات، اشعار اور مصرعہ تاریخِ وفات

1. جناب نسیم امروہوی:

لکھ دو نسیم باکمال قبر پہ سالِ انتقال
بقعۂ پاک محوِ خواب شاعرِ اہلِ بیتؑ نجم

1975ء

2. جناب رئیس امروہوی:

فراقِ نجم آفندی مرحوم
"غروب انجم نجم" اے قلم لکھ

1395ھ

3. جناب فیضؔ بھرت پوری:

رحلت شاعرِ فنا فی اللہ
حجم آفندی اکبر آبادی

1975ء

4. جناب ساحرؔ لکھنوی

سال رحلت کے لئے قبر پہ لکھ دو ساحرؔ
حجم ہے دامنِ مدفن میں ستارے کی طرح

1395ھ

5. جناب کسرتیؔ منہاس:

دُریک دانہ نکتہ داں شاعر

1395ھ

شاعرِ نکتہ داں گرامی تبار

1975ء

6. جناب نیسانؔ اکبرآبادی

تذکرۂ اہلِ بیت جس کا تھا شغلِ سخن
خلد میں وہ آگیا شاعرِ شیریں نوا

1975ء

7. جناب خلشؔ پیر اصحابی:

الف سے الم کے خلشؔ اب تو یوں
ہے لکھا غم حجم دائم رہا

1395ھ = 1394 + 1

8. جناب باقرؔ امانت خوانی:

اس طرح باقرؔ نے کھینچا منظرِ سالِ وفات
اب فلک سے شاعری کے حجم ٹوٹا جلوہ ریز

1975ء

9. پروفیسر فیضی:

بتائید الٰہی یہ شرف فیضی انہی کا تھا
عزادارِ شہید کربلا تھے نجم آفندی

1975ء

10. جناب شائق زیدی:

رہے وہ اے شائق بہ تجمل — شاعرِ اہل بیتؑ جہاں میں
پڑھتے ہوئے آیاتِ ماتم — نجم گئے ہیں باغِ جناں میں

1395ہجری

11. جناب فضل الدین فدا

تعزیت نامہ پاسدار اہل حق

1395ہجری

وفاتِ حسرت آیات جلیل القدر

1975ء

مرجع کرم خسروِ اقلیمِ دانش

1975ء

برگزیدۂ رحمٰن نازش ملّت نجم آفندی اعلی اللہ مقامہ

1975ء

وحیدِ زماں بلند آستاں نور اللہ مرقدہ

1395ہجری

یہ صدمہ کس قدر غم آفریں ہے — نظر بے چین دل اندوہ گیں ہے
فدا لکھ نجم کی تاریخ رحلت — بلا شک ساکنِ خلدِ بریں ہے

1395ہجری

تعداد کل کلام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ

علاّمہ نجمؔ آفندی

نمبر شمار	صنفِ سخن	تعداد	تعداد اشعار
.1	غزلیں	195	1932
.2	رباعیات	591	1182
.3	قطعات	498	1001
.4	نعت	16	304
.5	قصاید	81	2519
.6	سلام	107	1375
.7	مراثی	3 (209بند)	627
.8	نوحے	144	2237
.9	تاثیر زیارات	10	128
.10	متفرقات	83	1036
.11	ہندی کلام	18	458
کل اشعار = (12799)			

ڈاکٹر مقام حسین جعفری

فتحِ مبین کا اجمالی خاکہ

حجم آفندی کے مرثیے کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ اندازِ بیان میں تاثیر ہے جو حجم کے خلوص کی آئینہ دار ہے لیکن ان کی مقبولیت اور شہرتِ دوام کے ضامن اُن کے نوحے اور ماتم ہیں جو ''اشاراتِ غم'' ''آیاتِ غم'' اور ''تصوراتِ غم'' میں شامل ہیں۔ جن کی نمایاں خصوصیات درد و غم، سوز و گداز، تبلیغی عنصر، پیام امن و آشتی، واقعہ نگاری، جذبات نگاری، مرقع کشی، خلوص و نغمگی، ہندی الفاظ کا برمحل استعمال اور محاسنِ زبان ہیں۔ ''آیاتِ ماتم'' میں دو مسدس خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ''تیرہ سو برس بعد'' اور ''رخصتی سلام'' مسدس کے ضمن میں حجم کے دو مرثیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

''فتحِ مبین'' اور ''معراجِ فکر'' دونوں مرثیے حجم کے شاہ کار مانے جاتے ہیں لیکن ان کی تکنیک قدیم[1] مرثیوں کی تکنیک سے مختلف ہے۔ اس لیے یہ جدید مرثیوں کی زد میں آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں برصغیر ہند میں بہت سی سیاسی، معاشی اور اقتصادی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں جن سے اردو ادب اور شاعری کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ شاعری سوسائٹی کی تابع ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ صنفِ شاعری میں بھی تبدیلیاں رونما ہوں تا کہ وہ وقت کے اہم تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔

جدید مرثیہ کی ابتداء: میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، نفیسؔ، اسیرؔ، مونسؔ، فارغؔ، وحیدؔ، عروجؔ، رشیدؔ، تعشقؔ، عارفؔ، فائقؔ، اوجؔ، اور دیگر مرثیہ گو شعراء کے بعد قدیم مرثیہ کی تکنیک میں اضافے کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرثیہ کا عہدِ زریں اختتام پذیر ہو گیا لیکن غمِ

---

[1] چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین، اور بعد میں ساقی نامہ کا اضافہ ہوا

حسینؑ کو ہر حالت میں زندہ رہنا ہے اس لیے مرثیہ میں نئے فکری رجحانات کی تلاش ہوئی۔''

1927ء سے قبل جناب جوشؔ ملیح آبادی نے ''ذاکر سے خطاب'' اور ''سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب'' لکھ کر نئے طرز کی مرثیہ نگاری کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ 1939 میں لکھنؤ میں ''ایجی ٹیشن'' ہوا۔ اس کے پیشِ نظر مسلمانوں کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کرنے بلکہ جھنجھوڑنے کی ضرورت پیش آئی اور ''بین المسلمین'' اتحاد کی بھی۔

شاعر، سوسائٹی کا نباض ہوتا ہے وہ بگڑتے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر معاشرہ کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی کوششوں کے نتیجے میں 1939ء میں جناب سید آل رضا نے جدید طرز کا پہلا مرثیہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔ ''شہادت سے پہلے'' اور مطلع حسبِ ذیل ہے:

''کلمہ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت پر''

یہ مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا گیا ہے جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ اس مرثیے میں سید صاحب نے اپنی جدت طبع اور اختراع کا ثبوت دیا۔ فکر و نظر کے مختلف نظریے پیش کیے۔ مرثیے کی اخلاقی اقدار کو اجاگر کیا۔ یہ مرثیہ ''سنگ میل'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

1940ء میں جناب جوشؔ نے ''حسین اور انقلاب'' کے عنوان سے ایک مسدس لکھا جس نے سامعین اور قارئین کو بہت متاثر کیا۔

1941ء میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں سیزدہ صد سالہ یادگارِ حسینؑ منائی گئی۔ جلسوں میں مسلمانوں کے اتحاد اور رسول اکرمؐ کے نواسے امام حسینؑ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی گئی۔

1944ء میں سید آلِ رضا صاحب کے جدید طرز کے دونوں مرثیے شائع ہوئے۔ ''شہادت سے پہلے'' اور ''شہادت کے بعد'' (جس کا مطلع تھا ''قافلہ آلِ محمدؐ کا سوئے شام چلا'' ان مرثیوں میں امامؑ عالی مقام کے ''پیام'' اور ان کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جناب آلِ رضا کے ہم عصر جناب جمیلؔ مظہری، جناب نسیمؔ امروہوی، زائرؔ سیتاپوری مرحوم اور دوسرے مرثیہ گو شعراء نے بھی جدید طرز کے مرثیے کہے۔

حضرت نجم آفندی کے نوحوں میں تبلیغی رنگ پایا جاتا تھا۔ انھوں نے ''حسینی مشن'' کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور 1943ء میں نئے طرز کا مرثیہ کہا ''فتح مبین[1]'' اس کے پیش لفظ میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

''میں نے بھی اس صنفِ میں قلم اٹھایا ہے۔ ایک مرثیہ پیش کر رہا ہوں جس میں اس بلند آہنگی شوکتِ الفاظ اور اظہارِ حقیقت کے ساتھ واقعہ کربلا جس کا مستحق ہے۔ مرثیت کے عنصر میں بھی کمی نہیں آنے پائی ہے۔''[2]

اس مرثیہ کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کی افادیت کا علم ہو سکے

پہلا بند

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا　　بدلا لہو سے رنگِ بیابانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور ہی عنوانِ کربلا　　سوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا قتل گاہ میں لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتحِ حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

پہلے ہی بند سے واقعہ نگاری کی ابتداء ہوتی ہے۔ امام حسینؑ نے جامِ شہادت نوش فرمایا بظاہر یہ ان کی شکست تھی لیکن دراصل یہ تو حق کی فتح تھی۔ ''لے لیا'' نے اسی مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ امام حسینؑ کا سرِ اقدس نوک نیزہ پر فتح کا اعلان ہو رہا تھا۔ باطل کی شکست ہوئی اور یزید کا نام شامل دشنام ہوگیا۔

اس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت یا حسینؑ[3] کا دنیا میں شور ہے

تیسرا بند ملاحظہ فرمائیے:

وہ حریت کو فخر وہ انسانیت کو ناز　　وہ رو بہ قبلہ دینِ پیمبرؐ کا چارہ ساز

---

[1] نجم آفندی فتح مبین مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ تعداد بند 64 بار اول 1943ء

[2] // // حوالہ بالا ص2

[3] انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ (جوشؔ)

مقتل کی سرزمین کو وہ مولد سے امتیاز چھائی ہوئی حسینؑ کی وہ آخری نماز
معراج آدمی کے قرار و شکیب کی
ہمدوشِ کہکشاں وہ بلندی نشیب کی

امام عالی مقام کے کارناموں پر انسانیت بجا طور پر فخر سے سربلند کرسکتی ہے۔ دینِ حق کی خاطر امام نے سر دے کر اسلام کا بھرم رکھ لیا۔لفظ چارہ ساز اس کی غمازی کر رہا ہے کہ یزید مذہب اسلام کو مٹانے کے در پے تھا۔ امام حسینؑ کا آخری سجدہ کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سجدے پر کون و مکان نثار، اسی سجدے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام بچ گیا۔ امام مظلوم نشیب میں تھے۔ خنجر اور گلو کا مرحلہ تھا۔نشیب سے تکبیر کی صدا آتے آتے بند ہوگئی۔ وہ سرزمین اس درجہ سرفراز ہوئی کہ اس کا فرق افتخار آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گیا۔

پانچواں بند:

وہ شاندار موت وہ بنیادِ انقلاب بیعت کا وہ سوال وہ دنداں شکن جواب
مجبوری حیات سے کونین کو حجاب نیزہ پہ سرِ حسینؑ کا مغرب[1] میں آفتاب
صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

رسول اکرم ﷺ کے نواسے امام حسینؑ نے جس طرح موت کا خیر مقدم کیا۔ دین حق کی خاطر ایک دن میں بہتر گلے کٹوائے۔ خالق کی راہ میں اپنا گھر بار لٹا دیا۔ اس کی مثال عالم کے کارخانے میں نہیں مل سکتی۔ اس قربانی کی وجہ سے سارے عالم میں امام علیہ السلام کی دھوم مچ گئی اور ان کی موت، حیاتِ جاوداں بن گئی۔ ایسی موت کو شاندار کہنا نہایت موزوں ہے۔ امام عالی مقام نے باطل کے سامنے سر نہ جھکایا۔ بیعت یزید سے انکار کر دیا۔

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید

نتیجہ یہ ہوا کہ

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است

---

[1] سر اس طرف حسین کا نیزے پہ جلوہ گر مغرب میں آفتاب ادھر ڈوبتا ہوا (نجم)

امام مظلوم کے قتل کے بعد اس غضب کی آندھی اٹھی کہ الامان، سورج کو گہن لگ گیا۔ وہ اس خونیں منظر کی تاب نہ لا سکا کہ راکبِ دوشِ رسولؐ کا سر، نیزے پر ہو۔

''تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو''

اس بند کا انداز بیان کس قدر دل کش ہے۔ بیت بار بار پڑھیے۔ آئینہ جمالِ رسالت، صابر و شاکر حسینؑ کس شام سے بغل گیر ہوا۔ اس آن بان پر چاند اور سورج کی چمک دمک صدقے۔ تارے آسمان پر درود پڑھیں تو تعجب کیسا۔

بعد قتل حسینؑ حشر کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن

حدِ ادب پر صبح قیامت رُکی ہوئی
قدموں پہ عرش و فرش کی گردن جھکی ہوئی

آسمان سے صدا آئی تھی کہ یہ روز حشر ہے لیکن حکم خالق نہیں ہے اس لیے سوا نیزے پہ آفتاب نہیں آیا۔ ''حد ادب'' کا ٹکڑا معنویت سے بھرپور ہے۔

یہ مضمون جدید طرز کے مرثیوں کی خصوصیات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ صرف چند اشارے کیے جا سکتے ہیں۔ جدید طرز کے مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انسان کو اخلاق حسنہ سکھائے۔ کائنات عالم کے لیے کربلا ایک ایسی درس گاہ ہے جس کا پیام ہر قوم کے لیے ہے اور ہر دور کے لیے ہے۔ سنیے:

نظمِ جہاں بدلنے کا عنوان مرحبا　　اسلام کی نجات کا سامان مرحبا
انساں صداقتوں کا نگہبان مرحبا　　بندہ خدا کی راہ میں بے جان مرحبا
اپنے اصول چھوڑ گیا غور کے لیے
اس کا پیام ایک ہے ہر دور کے لیے

پیام شبیریؑ حقیقت ابدی ہے کہ ''ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔'' امام عالی مقام کے بہتر مجاہدین بھی اس پر عمل پیرا تھے۔

مذہب اسلام نے مساوات کا درس دیا، اس کا عملی ثبوت معرکہ کربلا میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

بند۔ ۱:

عالم میں بے مثال ہے یہ کربلا کی جنگ　　یکساں وغا کی بندہ و آقا کو تھی اُمنگ
کچھ سن کا امتیاز نہ تفریقِ نسل و رنگ　　حق کی صلائے عام تھی میدان تھا نہ تنگ
ہر باوفا حسینؑ کے قدموں میں سوگیا
آقا کا خوں غلام کا خوں ایک ہوگیا

شہدا میں اٹھارہ بنی ہاشم تھے۔ باقی امام عالی مقام کے اصحاب و انصار جن میں حضرت جون بھی شامل تھے۔ ہم آہنگی کی و ہم رنگی مثال ملاحظہ فرمایئے۔ جس طرح علی اکبر کی میّت میدان سے اٹھا کر لائے، اُسی طرح حضرت جون کی بھی۔ اللہ رے جوش وولولۂ جنگ۔

اس معرکہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ذرا ذرا سے بچے بھی سپاہی کا کردار ادا کررہے تھے۔ ایک بے شیر بے زبان مجاہد نے[1] **ھل من ناصر ینصرنا ھل من مغیث یغثنا** کی صدا سن کر اپنے آپ کو گہوارے سے گرادیا۔ جب امام عالی مقام خیمے میں تشریف لائے تو حضرت علی اصغرؑ ہمک کر ان کی گود میں چلے گئے۔ اتمامِ حجت کے لیے امام حسینؑ اس ننھے مجاہد کو میدانِ کارزار میں لے گئے۔ حضرت علی اصغرؑ نے سوکھی زبان ہونٹوں پر پھیری۔ **اقطع کلام الحسین**[2] کا حکم ملتے ہی حرملہ نے تیر پھینکا جس سے حضرت علی اصغرؑ کا ننھا سا گلا چھد گیا۔ باپ کی گود میں ننھا ڈھلک گیا:

جانِ رباب و جانِ پدر جانِ کربلا
چھ ماہ کا وہ فاتحِ[3] میدانِ کربلا

بند ۱۶ سے بند ۱۸ تک اسی بے زبان شہادت کا ذکر ہے۔ ''جس کا جھولا خالی ہے'' اس میں بلا شک وشبہ کی کیا گنجائش کہ:

---

[1] امام حسینؑ کی آواز استغاثہ کائنات میں گونج گئی۔ ہے کوئی جو میری نصرت کرے۔ کوئی میری آواز استغاثہ پر لبیک کہنے والا ہے۔

[2] حسینؑ کے کلام کو قطع کردو۔ امام مظلوم، بے زباں کے لیے پانی مانگ رہے تھے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے

[3] تہذیب لاشِ اصغرؑ ناداں پہ نوحہ گر　اخلاق کی نگاہ سے عالم گرا ہوا　(نجم)

بند: ۱۸

تاریخ جس کے قتل کی لائی نہیں مثال　　پانی کے مانگنے پر ہو گرتا لہو میں لال
اس زخمِ دل کا بھی کہیں ممکن ہے اندمال　　وہ دردناک موت کہ تفصیل ہے محال
سجادؑ جن کے صبر کی کچھ انتہا نہیں
پوچھیں کہ شیر خوار کا قاتل ملا نہیں

بند ۱۹ سے بند ۲۵ تک شہزادہ علی اکبرؑ ہم شبیہہ پیغمبرؐ کا تذکرہ ہے۔ حسبِ ذیل بند میں اس روایت کی طرف اشارہ ہے کہ شبِ عاشور جب حضرت علی اکبرؑ خیمے میں سو رہے تھے تو ان کی والدہ ماجدہ حضرت ام لیلیٰ شمع جلا کر اپنے یوسفِ کنعاں کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ یہ آج رات کا اور مہمان ہے کل اس کی قربانی پیش کی جائے گی۔

بند: ۲۰

وہ عزم و اختیار و قدرت کہ الاماں　　وقتِ اجل قریب تھا ایک شب تھی درمیاں
کیا مطمئن خیام میں سویا یہ نوجواں　　تصویرِ درد ہے شبِ عاشور کا سماں
دل سے لگی تھی شکلِ پسر دیکھتی رہی
ماں شمع لے کے تا بہ سحر دیکھتی رہی

ماں کی مامتا اور فرض شناسی کے جذبے میں تصادم۔ دل پہ یہ اختیار کہ اپنے لال کو دولھا بنا کر میدانِ کارزار میں بھیج دیا۔ اس سلسلہ کا آخری بند بھی سن لیجیے:

بند: ۲۴

دنیا میں یادگار ہے اس شیر کا جہاد　　یہ حال تھا کہ جیسے بر آئی دلی مراد
مقصودِ زندگی نے کیا جب اجل کو یاد　　آئی فضائے دشت سے آواز زندہ باد
توڑا پدر کی گود میں دم نورِ عین نے
تنہا تھے خود ہی لاش[1] اٹھائی حسینؑ نے

بند ۲۶ سے بند ۳۰ تک حضرت قاسم بن حسنؑ کی معرکہ آرائی کا بیان ہے۔ وہ بھی اس

---

[1] یہ ضعف اور یہ لاشہ جوان بیٹے کا　　یہ تیرے دوش پہ کوہِ وقار کیا کہنا　(نجم)

اصول پر عمل پیرا تھے کہ جان جائے لیکن اسلام کی آن بان پر آنچ نہ آنے پائے۔

بند: ۲۷

یہ نوجواں تھے جن کی جوانی کو آفریں تعمیرِ قوم کرتے ہیں ایسے ہی خوش یقیں
اسلام کی حیات تھی مقصودِ اولیں دھڑکا یہ تھا اصول کو جنبش نہ ہو کہیں

شایانِ حرزِ جاں نہ تھے تیور دلیر کے
تعویذ حسبِ مرگ تھا بازو[1] پہ شیر کے

حضرت قاسمؑ کی لاش پامالِ سمِ اسپاں ہوگئی۔ اور لاش کے ٹکڑے چادر میں لپیٹ کر خیمے میں پہنچائے گئے۔

مادر کے صبر وضبط کا ممکن نہیں جواب

بند ۳۱ تا ۳۴ حضرت زینبؑ کے دونوں صاحبزادوں (عونؑ و محمدؑ) کی جنگ اور شہادت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

حضرت زینبؑ نے اپنے بچوں کو دولھا بنا کر میدانِ کارزار میں بھیجا تھا:

نزدیک آرہے تھے جوانی کے صبح و شام جینے سے منہ پھرائے تھے لیکن یہ لالہ فام
طرزِ ادا کس قدر پُرکشش ہے۔ دونوں کا بچپن تھا ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔

بند: ۳۴

دم بھر کیا نہ موت کی منزل میں پیش پس تیغیں چھٹیں نہ ہاتھ سے جب تک تھا دسترس
کیا زندگی دلوں میں تھی کیا بازوؤں میں کس کیسے متاعِ فخر تھے وہ آخری نفس

جن میں فقط حسینؑ کی خدمت کا جوش تھا
جینے کی آرزو تھی نہ مرنے کا ہوش تھا

آقا کی خدمت اور اطاعت گزاری کی لگن ہو تو ایسی ہو۔

---

[1] حضرت امام حسینؑ کسی طرح حضرت قاسمؑ کو میدان جنگ کی اجازت دینے پہ تیار نہ تھے۔ اس وقت حضرت قاسمؑ نے اپنے بازو پہ جو تعویذ بندھا تھا، اسے کھولا جس میں امام حسنؑ کی وصیت تحریر تھی۔ اس طرح حضرت قاسمؑ کو اجازت ملی۔

بند ۳۵ سے ۳۷ تک حضرت مسلم کے دونوں صاحبزادوں کی شہادت کا بیان ہے۔ امام مظلوم کی خاطر دونوں نے اپنے گلے کٹوا دیے۔ ان منچلوں کی جنگ بھی یادگار تھی۔

بند: ۳۷

وہ حسنِ بے پناہ وہ اٹھتی جوانیاں جن کا بیاں کر نہ سکیں خوش بیانیاں
مظلوم ایلچی کی وہ مٹتی نشانیاں اب تک ہیں مرثیہ کی زباں میں کہانیاں
یہ نوجواں آپ ہی اپنی مثال ہیں
اسلام کا غرور ہیں مسلمؑ کے لال ہیں

اگلے بند میں تجمم آفندی نے کربلا کے ہر شہید کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ہر ایک مجاہد کی ادائے شہادت دل نشیں تھی۔ عالم اسباب ایسی نظر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بیت ملاحظہ ہو۔

کیا جانے کیسے ارض و سما تھے ٹکے ہوئے
اللہ ایک دن میں یہ سب معرکے ہوئے

عاشور کے دن نبرد کا میدان لہو سے لال ہو گیا تھا اور رہ رہ کر ہنگامۂ قتال گرم ہوتا تھا۔ امام مظلوم کے دل پر بہتر داغ تھے۔ ہجوم کرب میں وہ عزم و ثبات۔ یک ہزار پنجاہ زخم جسمِ اقدس پر۔ امامؑ کا سوکھا گلا اور شمر کا خنجر۔ شاعر متحیر اور ششدر ہے کہ زمین و آسمان ایسے خونیں مناظر کی تاب کیسے لا سکے۔ دفترِ عالم کا ورق الٹ کیوں نہیں گیا۔ لفظ ''اللہ'' میں فریاد بھی ہے اور رضائے الٰہی کا تصور بھی۔

بند ۳۹ سے بند ۴۰ تک قمرِ بنی ہاشم حضرت عباسؑ کی چند صفات کا تذکرہ ہے۔ اس عہد کے علمی کی معرکہ آرائی کا اختصار سے بیان ہے۔ ان کے دل میں ولولۂ کارزار تھا۔ بے ساختہ لجامِ فرس فرات کی جانب اٹھ گئی۔ لڑتے ہوئے ترائی میں پہنچ گئے۔ زمین کانپنے لگی اور سرکشوں کے سر برسنے لگے۔ تاوسعتِ نظر لاشے ہی لاشے دکھائی دیتے تھے۔ حشر کے سامان آشکار تھے۔ مشک سکینہؑ بھر لی لیکن خود پیاسے رہے۔ خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے جا رہے تھے کہ نرغہ اعداء میں گھر گئے اور دونوں شانے قلم ہو گئے۔ اس مفہوم کو شاعر نے حسب ذیل بیت میں کس عمدگی سے ادا کیا ہے:

چرچے بہادروں میں ہیں اس جاں نثار کے
بازو دیے ہیں مشک پہ صدقے اتار کے

بند:۴۳

اشرار سے نگاہ ملاتا ہوا چلا تیروں کی زد سے مشک بچاتا ہوا چلا
پانی سا اپنا خون بہاتا ہوا چلا تلواریں جھوم جھوم کے کھاتا ہوا چلا
سو زخم کھائے اور غش کھا کے گر پڑا
آیا جو تیر مشک پہ تیورا کے گر پڑا

حضرت عباسؑ کی آرزو تھی کہ خیام اہل بیت تک پانی پہنچا دیا جائے۔سکینہؑ سے پانی لانے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ ایفا نہ ہوسکا۔اس لیے منہ چھپائے ہوئے ریتی پر پڑے ہوئے ہیں [1]

اسد اللہ کا لال ہو بہو، اسد اللہ ہے اور

بند:۴۴

یہ شیر ہے دیارِ جلالت کا حکمراں ملّت کے نوجوان دلوں کا نگاہباں
صدیوں سے اس کے نام پہ عاشق ہیں نوجواں ہر ایک جانتا ہے اسے میرِ کارواں
سینوں میں دل تڑپتے ہیں تسلیم کے لیے
جھکتے ہیں سر نشان کی تعظیم کے لیے

حضرت عباسؑ علم دارِ لشکر ہمت و جرأت کا پیکر تھے۔صداقت کے پیامبر تھے۔نشان فوج پیمبر کی سلامی کے لیے حریت بھی خم ہوتی ہے۔

بند۴۶ سے بند۵۱ تک حضرت عبداللہ بن حسنؑ کی شہادت کا لرزہ خیز بیان ہے۔عصر کے وقت جب امام مظلوم زخموں کی تاب نہ لا سکے اور زین فرس سے خاک پر تشریف لائے، اس وقت گیتی کو زلزلہ ہوا۔حضرت عبداللہ نے درِ خیمہ سے دیکھا کہ امام پر نیزوں اور تلواروں کے وار ہو رہے تھے۔بچہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور دوڑتا ہوا امامؑ کے پاس پہنچ گیا۔

---

[1] کتا کے ہاتھ ترائی میں سو گئے عباسؑ علم حسینؑ کے خیمہ میں لایا جاتا ہے (نجم)

بند: ۴۹

دو دن کی بھوک پیاس میں یہ ہوش یہ حواس　　یہ فرض کا شعور محبت کی یہ اساس
جب عزم مستقل ہو تو کیا خوف کیا ہراس　　خطروں کو روندتا ہوا پہنچا یہ حق شناس
ہاتھوں نے بڑھ کے گرمیِ رفتار روک لی
آتی ہوئی حسین پہ تلوار روک لی

اللہ اللہ کم سن بچے میں فرض شناسی کا یہ جذبہ۔ ایثار وقربانی ایسے ہی جذبوں سے سرشار افرادقوم، کا رہائے نمایاں انجام دے سکتے ہیں۔ واقعات کربلا ہماری زندگی کا مکمل نظام پیش کرتے ہیں۔ اس لیے افرادقوم کو اخلاقی اقدار کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ تعمیری کاموں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں۔

بند: ۵۴

اس یادگار صبح کی وہ یادگار شام　　وہ قتل گہ کے سامنے جلتے ہوئے خیام
میدان میں حسین کے اہلِ حرم تمام　　بچوں کی عورتوں کی اسیری کا اہتمام
بازو بھی ریسمان بھی طوق اور گلو بھی تھا
کامل تھا ظلم آگ بھی تھی اور لہو بھی تھا

بین

ابتدائی دور میں دکن میں جو مرثیے لکھے گئے ان کا مقصد ہی رونا رلانا تھا۔ شمالی ہند میں جب اس صنف نے ترقی کی تو مرثیے کی ہیئت اور تکنیک میں بین کو مرثیہ کا اہم جزو قرار دیا گیا۔ جدید طرز کے مرثیہ کو حضرات نے مروجہ تکنیک کو خیر باد کہہ کے مرثیے میں نئے نئے گوشے تلاش کیے اور مرثیے کے لیے نئے نئے موضوع منتخب کیے لیکن یہ بھی کہا کہ:

''خوش نشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ''

بالفاظ دیگر بین کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

نجم آفندی نے شام غریباں کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس کے نقوش آج بھی ابھرے ہوئے نظر آرہے ہیں اور وہ ''مصور غم'' کہے جانے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

نجم نے ''فتح مبین'' میں لوچدار زبان اور درد بھرے لہجے میں شہیدان راہ حق کی مدح کی۔ ان کے پیام امن و آشتی اور اصول پرستی کو عام کیا۔ افراد قوم کو ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی۔ انھیں جرأت، محبت اور شجاعت کا درس دیا اور ببانگ دہل اس کا اعلان کیا کہ حسینیوں کی ہدایت کے لیے ''شہادت عظمیٰ'' مشعل ہدایت ہے اور اس مادی دنیا کے حسن و جمال پر وہ فریفتہ نہیں ہوتے بلکہ ان کا مطمح نظر ہے ''عزت کی زندگانی'' باطل کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا اور سچے اصولوں کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرنا۔

امام عالی مقام نے صرف میدان کربلا ہی نہیں لے لیا بلکہ کائنات کے ذرے ذرے کو مسخر کرلیا۔ حسینیت کے دامن میں آنے کے لیے نہ تو نسل و رنگ کی قید ہے اور نہ ذات پات کی بلکہ کربلا کے معین کردہ اخلاقی اقدار کو اپنانے کی اور حسینی مجاہدین کی سیرت پر عمل کرنے کی۔

عظیم شاعر نجم آفندی آج ہم میں نہیں ہیں لیکن انھیں اہل بیت علیہ السلام سے عشق تھا، لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ

''ہر گز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق۔

○

مرثیہ

فتحِ مبین

ع : جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا!

64 بند

تصنیف 1943ء

فتحِ مبین

(1)

جب لے لیا حسینؑ نے میدانِ کربلا
بدلا لہو سے رنگِ بیابانِ کربلا
تھا وقتِ عصر اور ہی عنوانِ کربلا
سوتا تھا فرشِ خاک پہ مہمانِ کربلا
بے سر تھا قتل گاہ میں لاشہ پڑا ہوا
بالیں پہ فتحِ حق کا تھا جھنڈا گڑا ہوا

(2)

ریتی کی سجدہ گاہ پہ خونِ پیمبری
ڈوبی ہوئی لہو میں قبائے غضنفری
کون و مکاں میں رعبِ شہادت سے تھرتھری
ایسی سکندری تھی کسی کی نہ قیصری
اس دن سے آج تک یہ حکومت کا زور ہے
ہر سمت یا حسینؑ کا دنیا میں شور ہے

(3)

وہ حریتؔ کو فخر وہ انسانیت کو ناز
وہ رو بقبلہ دینِ پیمبرؐ کا چارہ ساز
مقتل کی سر زمیں کو وہ مولد سے امتیاز
چھائی ہوئی حسینؑ کی وہ آخری نماز
معراج آدمی کے قرار و شکیب کی
ہمدوش کہکشاں وہ بلندی نشیب کی

(4)

وہ شاندار موت وہ بنیادِ انقلاب
بیعت کا وہ سوال وہ دنداں شکن جواب
مجبوریِ حیات سے کونین کو حجاب
نیزہ پر سر حسینؑ کا مغرب میں آفتاب

صدقے ضیائے مہر و قمر آن بان پر
تارے درود پڑھتے ہوئے آسمان پر

(5)

قدسی مقامِ عرض پہ باندھے ہوئے پَرا
پیشِ نگاہ مجمعِ ارواحِ انبیاؑ
ہیبت سے زلزلہ میں ادب گاہِ کربلا
ہر سمت سے ارادتِ کونین رونما

طوفانِ بحر و بر میں عناصر لیے ہوئے
سب امتثالِ امر میں سر خم کیے ہوئے

(6)

وہ خون میں رنگے ہوئے گیسوئے تابدار
وہ خاک میں اٹا ہوا زہراؑ کا گل عذار
دونوں طرح حقیقتِ اسلام اُستوار
قرآن اس کے سینہ میں پہلو میں ذوالفقار

حدِ ادب پہ صبح قیامت رُکی ہوئی
قدموں میں عرش و فرش کی گردن جھکی ہوئی